کلام غالبؔ میں عشق کا تصور

Subject : **Urdu**
Class : B.A. (Hons.) II
Topic : Kalam e Ghalib men Ishq ka tasawwur
Author : **Dr. Fatahullah Quadri**
Lecture Series No. : 07

مرزا غالب کی شاعری، اردو کے پورے شاعری سرمائے کے درمیان اس اعتبار سے خاصی ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے کہ غالب کے یہاں موضوعات، مسائل اور واقعات اپنی موضوعاتی اور وقعاتی سطح سے اکثر بلندی اور تصوراتی ارتفاع حاصل کر لیتے ہیں۔اس رویے میں موضوعات کی پیش کش کے بجائے پیش کش کے طریق کار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسی طریق کار میں غالب کے یہاں پائے جانے والے انشائیہ اور استفہامیہ لہجے کا جواز بھی موجود ہے اور اسی فنی کاریگری کے باعث وہ عمومی موضوعات کی سطحیت کے بھی شکار نہیں ہوتے اور واقعاتی ابھرے پن تک کو اسلوب کی تہہ داری میں تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔اگر اس بات کو غالب کے ایک شعر کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ان کی شعر سازی کے اس حاوی رجحان کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے۔ان کا ایک شعر ہے:

جوش جنوں میں کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشت خاک ہے

یہاں صحرا کا نظروں سے مخفی ہو جانا ہو یا صحرا کا بے حیثیت ہو جانا ہو، یا پھر صحرا کا حد درجہ سمٹ کر ایک مشت خاک کے جوہر میں منقلب ہو جانا، یا اسی نوع کے دوسرے امکانی مفاہیم کی گنجائش ہو، سارے احتمالات استعاراتی تہہ داری اور لسانی قلب ماہیت کے سبب پیدا ہوئے ہیں۔اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ غالب کے شعری بیانات میں اشیاء کی تقلیب کا رویہ بہت نمایاں ہے۔اس انداز اظہار کو غالب کی شعری زبان کی اس تخصیص سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ یہ زبان اپنے مانوس اور مروج مدلول سے اکثر متصادم اور دلالتوں کے قدرے مختلف نظام کی تشکیل کی طرف مائل رہتی ہے۔

غالبؔ کی شاعری میں عاشق کے کردار یا تصور عشق سے متعلق موضوعات و مسائل کو سمجھنے کے لیے اس تمہید کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ غالب کے عشقیہ بیانات کو متعدد نکتہ رس ناقدین نے بجا طور پر تجریدیت سے ہم آہنگ بتانے کی کوشش کی ہے مگر اس کے اسباب تک رسائی حاصل کرنے کی طرف کم توجہ صرف کی گئی ہے۔اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود ایسا بھی نہیں ہے کہ کلام غالب میں راست طور پر عشقیہ برتاؤ یا عشق کے مضامین کا بلا واسطہ بیان نہیں ملتا۔مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس

قسم کے اشعار میں بھی اکثر مقامات پر عشقیہ موضوع کی مرکزیت غالب کے شعری طریق کار کی بدولت تبدیل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے:

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
کیا، کس نے جگر داری کا دعویٰ — شکیب خاطر عاشق بھلا کیا
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائی خیال کہاں
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
گھر میں رہا رہین ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
کم جانتے تھے ہم غم عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

ان اشعار میں بڑی آسانی سے عشق کے موضوع کی پیش کش کے مختلف پہلو اور مختلف انداز کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ مگر عشق کے موضوع کو وسیلہ بنا کر کہیں عاشق کی بے سروسامانی زیر بحث ہے، کہیں صبر اور تمنا کی کشمکش، کہیں عاشق کی جگر داری، کہیں شاعر کی رعنائی خیال کے محرکات، کہیں زیست کا لطف دردِلا دوا میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ کہیں شگفتگیٔ گل، عشق بلبل سے کسب فیض کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کسی شعر میں غم عشق اور غم روزگار میں ایک کی مرکزیت پر اصرار ہے اور آخری شعر:

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

میں غالب کی موضوعاتی پیش کش کی انفرادیت کی کلید موجود ہے۔ جس میں غم روزگار بہ ظاہر غم عشق کی محض تقلیل معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت غم روزگار، غم عشق کی ساری صفات کی کشید کر کے ایک موہوم نقطے پر مرکوز ہوجاتا ہے۔ عشق سے متعلق اس نوع کے سارے بیانات اپنے اپنے موضوع کی تحلیل کرنے اور موضوعاتی اکہرے پن کو ہمہ جہتی کا بدل بنانے اور کسی نہ کسی بڑے سیاق وسباق میں تبدیل کرنے پر مبنی ہیں۔ اگر اس نوع کے اشعار سے غالب کے یہاں عاشق کے کردار کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شاعر غالب اور عاشق غالب، دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں اور عاشق غالب شعر کے متکلم سے الگ ایک خودمختار شعری کردار میں بدل جاتا ہے۔ غالب، اس کردار کو صحیح معنوں میں اپنا غیر یا اپنے سے غیر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر ایک تارِ بستر، خارِ بستر کیسے بنتا ہے؟ اس کا راز محض ہجر کی اذیت میں پوشیدہ نہیں بلکہ اس کردار کی بے تابی اور تخلیقی سرشت کا لازمہ بھی ہے۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

چونکہ ان کے غیر واقعاتی ذہن کی بنیادی صفت تشکیک، اور لہجے کا غالب عنصر استفہامیہ یا استعجابیہ ہے، اس لیے ہر تعمیر میں مضمر خرابی کی صورت کا مشاہدہ کر لینا اور مستحکم صورت حال اور اچھے بھلے معاملات کے اندر دیمک کی سرسراہٹ کو محسوس کر لینا، غالب کی شاعرانہ سوچ اور پیش کش کا لازمی حصہ بن جاتا ہے یہی وہ استفہامیہ لہجہ ہے جو غالب کے کلام میں معنوی ارتکاز کو تحلیل کر دیتا ہے اور اسی لہجے کے باعث عشقیہ مضامین بھی تجسیم سے بلند ہو کر تجرید کی سطح کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شاید ایسا اس لیے ہے کہ شاعرانہ عمل کی سرشت میں ہمیشہ سے تجریدیت اور ماورائیت لازمی طور پر شامل رہی ہے۔ اس لہجے کی نمائندگی اور شہادت کے لیے ان منتخب ترین اشعار سے بہتر مثالیں اور کیا ہو سکتی ہیں:

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟ خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق؟ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی؟ مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو؟

شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز میں میر تقی میر کے یہاں ہر طرح کی عظمتوں کی نشاندہی کرنے کے باوجود بجا طور پر انشائیہ لہجے کے معاملے میں غالب کی بالا دستی کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

''میر، تمام واقعات کو واقعات کی سطح پر برتتے ہیں۔ واقعات کی کثرت اور جذباتی معنویت کی بنا پر میر کی دنیا غالب کی دنیا سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ مگر غالب کے یہاں استفہام کی فراوانی میر سے زیادہ ہے۔ اس لیے ان کا کلام میر سے زیادہ رنگا رنگ ہے''۔

غالب کے یہاں محولہ بالا اشعار میں استفہامیہ اسلوب کے سبب جو رنگا رنگی ملتی ہے، ان میں استفہام برائے استفہام نہیں ہے۔ اس لہجے کی بدولت ہی ممکن جوابات کا احتمال کبھی غالب کے کلام کو بوقلموں بناتا ہے، کبھی یہ استفہامیہ انداز خود کلامی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، کبھی عشق کے تصور میں نئی جہات کا اضافہ کرتا ہے اور اکثر یہ انداز، خود عشق کے مزاج کے عین مطابق ان کے بیانات کو ایک سیال کیفیت سے دو چار کر کے متنوع بنا دیتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر اس حوالے سے اس بات کی بھی نشاندہی کر دی جائے کہ غالب کی اس افتادِ طبع اور شعر سازی کے طریقے کی بھینٹ اگر کوئی چیز چڑھتی ہے تو وہ جذبے کی صداقت ہے، اور اسی سبب سے غالب کے عشقیہ اشعار میں جذبے کی صداقت کا فقدان بڑی آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری میں مضمون عشق کا ہو یا زندگی کی کسی اور حقیقت کا، معنی آفرینی کا عمل دوسرے شاعروں کی طرح بالعموم

محض استعارہ سازی، تمثیل گری یا کسی اور فنی صنعت گری کا مرہون منت نہیں ہوتا، ان کے کلام میں استفہام اور استعجاب کے لہجے اور زبان کی نحوی ساخت کی شکست و ریخت سے بھی معنی کی فراوانی کو راہ ملتی ہے۔ اس بات کا اندازہ متذکرہ اشعار کے متنوع استفہامیہ لہجوں سے پیدا ہونے والی معنویت اور کثیر الاصواتی سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

کبھی عشق کے مضمون میں نت نئے معنی کا امکان پیدا کرنا اور کبھی عشق کے تجربے کی پیش کش میں کسی ایسے پہلو کو نمایاں کرنا کہ وہ کسی نئے مضمون کا نعم البدل بن جائے، یہ غالب کے شعری طریق کار کا عام حصہ ہے۔ یہاں محض نمونے کے طور پر بعض ایسے اشعار ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جن میں معنی اور مضمون، ایک دوسرے کے متبادل بن جاتے ہیں۔